قاضی عبدالستار بحیثیت فکشن نگار

محمد الیاس انصاری

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، موبائل: 8130646212

عصر حاضر میں فن اردو ناول نگاری کو فروغ دینے والوں میں قاضی عبدالستار کا نام اہم تھا۔ سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، اختر اور ینوی، خدیجہ مستور وغیرہ فن کاروں کے بعد ناول نگاری کی جو صف سامنے آئی ہے اس میں قاضی عبدالستار نمایاں تھے، جنھوں نے ''شب گزیدہ''، ''پہلا اور آخری خط''، ''داراشکوہ''، ''صلاح الدین ایوبی'' وغیرہ ناول لکھ کر زندگی اور اس کے تمام پیچیدہ مسائل کی ترجمانی کی۔ قاضی عبدالستار کہانی کے سلیقے سے بخوبی آشنا تھے۔ اپنے کرداروں کو وہ زندہ اور متحرک شکل میں پیش کرنا جانتے تھے، وہ اس سے بھی واقف تھے کہ ناول کے اسلوب کو دلچسپ بنائے بغیر ناول کا قصہ پرکشش نہیں ہوسکتا۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> ''قاضی عبدالستار جانتے تھے کہ ناول زندگی کی عکاسی کا نہیں بلکہ اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تخیلی تعمیر کا نام ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ذہن و احساس اور فکر و عمل کی ہر سطح پر اس کی پیچیدہ ماہیت اور جدلیاتی حقیقت کو دقت نظر سے دیکھا جائے۔ ان کی اسی بصیرت اور انسان دوستی نے اودھ کے ایک تعلق دار کنبے کی کہانی کو اس کے تمام سماجی روابط اور تہذیبی علائق کے ساتھ پیش کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں حقیقت نگاری کا ایک نیا اسلوب اور نیا معیار سامنے آتا ہے، قاضی عبدالستار ناولوں کو قصے کی حیثیت سے دلچسپ بنانے کا گر جانتے تھے، ان کی تخلیقی قوت ہر کردار کو روشن انفرادی پیکر بخشتی تھی، اودھی بولی کے استعمال سے بھی انھوں نے اپنے کردار میں ارضیت اور زندگی کی روح پھونکی تھی۔''

گہری سماجی بصیرت اور حقیقت پسندانہ شعور کے ساتھ زبان اور اندازِ بیان کی خوبصورت لچکداری ان کے ناول کو دل کشی بخشتی تھی۔ لفظوں، جملوں اور فقروں کا حسب ضرورت نہایت مناسب استعمال، تشبیہات کی ندرت اور محاورات کی برجستگی ان کے فن کو تازگی عطا کرتی تھی، اس صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شمس الرحمان فاروقی نے لکھا ہے:

> ''قاضی عبدالستار کی سب سے بڑی قوت ان کی حاضراتی صلاحیت ہے۔ ایڈگر ایلن پو کی طرح اس سے (انتہائی محنت سے سیاق و سباق میں) وہ نفسیات کو اجاگر کرنے کے بادشاہ ہیں۔''

دیہاتوں کی تصویر کشی اور جاگیر دارانہ نظام کے آخری نقش کو قاضی عبدالستار نے بڑی فن کاری اور خوش اسلوبی سے اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے، ان کے یہاں یہ نقش بے حد تابناک ہے:

> ''دیہات کی تصویر کشی اردو ناول میں قاضی عبدالستار ہی کے ذریعے ہوئی سجے ہوئے اندازِ بیان اور شاعرانہ اسلوب کے باوجود قاضی عبدالستار کا مشاہدہ گہرا اور تخیل کی اڑان بلند تھی، قاضی کو جادو جگانے کا فن آتا تھا۔''

قاضی عبدالستار کی سب سے اہم صفت ان کے اسٹائل کی دل آویزی اور انفرادیت تھی۔ انھوں نے تقلید کی روش سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا اور ناول نگاری کے میدان میں اپنی ایک الگ راہ نکالی تھی۔ یہ صفت بجائے خود ایک نمایاں اور امتیازی وصف کا درجہ رکھتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جاگیر دار، زمین دار اور طبقۂ امرا کے ہر فرد کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے انہیں مردود و مطعون قرار دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے فیشن کے طور پر ہر قلم کار ان کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھنا اپنا حق سمجھتا تھا اور ان کے معاشرے کے مسائل اور ان کے طبقے کی الجھنوں اور پریشانیوں کو نظر انداز کرنا ایک عام بات تھی۔ پہلی مرتبہ قاضی عبدالستار نے اس طبقے کو مجموعی طور پر اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور ان کے جبر و ظلم کے ساتھ ان کی مجبوریوں اور مظلومیوں کو بھی فن کارانہ احتیاط و ضبط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے اسلوب کی دلکشی اور تازگی نے ان کے ناولوں کی معاشرہ نگاری کو جادو اثر بنا دیا ہے۔ کردار نگاری کے سلسلے میں انتونوف اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''میں اپنے خیال پر اٹل ہوں کہ آپ کی کہانی کا کوئی کردار مثالی کردار نہیں ہوسکتا اور اپنے عہد کے معینہ تصورات کی نمائندگی کا دعویٰ کرسکتا ہے جب کہ وہ نمایاں خد و خال نظر آتے ہیں جنھیں خاص طور پر زور دے کر ابھارا گیا ہے جو سماج کے ایک مخصوص

گروہ میں پائے جاتے ہیں اور اس دور کے افراد کی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔''

قاضی عبدالستار کے کردار اس معیار پر پورے اترتے ہیں، ان کا کردار اپنے ماحول اور معاشرے کی نہایت مکمل ترجمانی کرتا ہے اور ان کے مخصوص اوصاف اتنے واضح ہوتے ہیں کہ انہیں پہچاننا ہرگز دشوار نہیں۔ ''شب گزیدہ'' کا ماحول دیہات کے طبقۂ امرا سے وابستہ ہے، جس کی خوبیوں اور خامیوں کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بڑے سرکار جام نگر کے جاگیردار صاحب ہیں جو قدامت پرستی کا شکار ہیں اور بالکل روایتی انداز میں اپنی زندگی گزارتے ہیں، رحمت علی خاں کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ دراصل رحمت علی خاں ہی ہے جو اپنی حکمت عملی سے جاگیردار صاحب کو کٹھ پتلی بنا کر تعلق داری کر رہا ہے۔ جمی، جاگیردار صاحب کا اکلوتا بیٹا ہے، جس نے لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی ہے، یہ روشن خیال بھی ہے اور ذہین بھی۔ تکمیل تعلیم کے بعد واپس آ کر پرانے ریاستی نظام میں معقول اصلاحات کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی کمزوریاں اور خامیاں دور ہوسکیں۔ جمی ایک شکیل اور ترقی پسند نوجوان ہے اور اپنی پھوپھی زاد بہن سے محبت کرتا ہے۔ ریاست کے مسائل سلجھانے میں وہ اپنے پھوپھا سے مدد لیتا ہے، بڑے سرکار اور جمی کے پھوپھا میں پہلے سے کشیدگی تھی۔ جمی اور اس کے پھوپھا کے ریاست میں بڑھتے ہوئے اثرات سے رحمت علی خاں خائف ہوگیا اور اسے اپنا اقتدار مشکوک نظر آنے لگا۔ چنانچہ اس نے بڑے سرکار کے کانوں کو جمی کے خلاف بھرنا شروع کیا اور نوبت یہ ہوئی کہ باپ نے بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بڑے سرکار کا کردار جامد نہیں متحرک ہے، مردہ نہیں زندہ کردار ہے، نئی نسل کی ترقی پسندی سے وہ مرعوب نہیں ہوتا، لیکن عیش وعشرت کا دل دادہ ہے، رحمت علی خاں نے اسے کبھی ریاستی امداد کے بارے میں کچھ نہ سوچنے دیا۔ رحمت علی خاں سازشوں سے بھرا ہوا کردار ہے جو ریاست میں اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے سرکار کو جمی کے خلاف اتنا بدظن کر دیتا ہے کہ بڑے سرکار اسے کسی قیمت پر معاف نہیں کرتے، وہ اپنے فیصلے پر ایک چٹان کی طرح قائم نظر آتے ہیں، چنانچہ اپنے واحد بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے زہر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ریاست کے مسئلوں سے بے تعلق، بے نیاز اور بے خبر رہتے ہیں اور حد یہ ہے کہ اپنے بیٹے کے مزاج سے بھی انہیں واقفیت نہیں، عیاشی ان کے کردار پر حاوی ہے۔

''شبو کی ماں مزاج کی کیسی ہے۔ چندرا اور ہون نے غیظ آلود نگاہوں سے رحمت علی خاں کو دیکھا۔ آگ کی بنی ہے سرکار، لیکن چاندی کا پانی بجھا کر رکھ دے گی۔ تو اس کو لال ساڑی پہنا دو۔''

ان کا کردار انہی لال ساڑیوں کے ماحول کا خوگر ہے، بے خودی ایسی کہ اپنی ریاست کے ''دشمنوں'' سے بھی غیر متعلق رہیں، کردار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اپنی راہ میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ اپنے بیٹے کو بھی نہیں۔ حالانکہ جمی شعوری طور پر بے حد بیدار اور حقیقت پسند نوجوان ہے، رحمت علی خاں کی رکاوٹوں کی وجہ سے جمی کو اپنے اصلاحی منصوبوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، اپنی پھوپھی زاد بہن بیدہ سے محبت کرتا ہے، لیکن یہ محبت بھی ایسی نہیں کہ جمی کے ہوش وحواس کو مختل کر دے، ریاستی امور کے سلسلے میں وہ تمام سازشوں سے باخبر ہے۔ اس لیے محبت کے دوران اسے اندیشے بھی لاحق ہیں، زبیدہ سے ایک روز دوران گفتگو کہتا ہے:

''میں ڈرتا ہوں زبے کہ میرا حشر داستان کے اس شہزادہ کا سا نہ ہو جس نے دس برس تلوار چلا کر قلعہ ختم کیا اور دس دس تک سحر پڑھ کر مردہ شہزادی کو زندہ کیا اور جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے شہزادے کا شکریہ ادا کیا کہ بولی کہ مجھے مازندران لے چلو میرا عاشق شاہ مازندران تم کو سونے میں تولائے گا۔''

جمّی کا کردار انجام کے اعتبار سے ایک المناک تاثر پیش کرتا ہے، یہ خلوص ومحبت اور نئے عصری شعور کا نمائندہ ہے۔ اس کے اندر زندگی، زندہ دلی اور دل کشی ہے، عام رئیس زادوں کی طرح وہ مجہول کردار نہیں بلکہ فعال کردار ہے۔ قارئین کی ہمدردی اور دلچسپی اس میں سمٹ کر رہ جاتی ہے، اس کا انجام جاگیردارانہ تمدن کے لیے ایک بدنما داغ بن جاتا ہے۔ جمی اپنے باپ کی ناعاقبت اندیشی، عیش پسندی اور سرکاری غفلتوں کا شاکی ہے، سدھار لانا چاہتا ہے، اصلاحی اقدامات کرتا ہے، لیکن ریاستی سازشوں کا شکار ہوجاتا ہے، اس ناول کا ایک اہم کردار اختر بھائی ہے، جن کی پرورش بڑے ناز ونعم سے ہوئی ہے، اسکول اور کالج میں تعلیم پائی، لیکن ہوش سنبھالتے ہی ملک اور قوم کے مسائل سے دلچسپی لینے لگے، کانگریس میں شامل ہوئے اور زیادہ تر وقت کانگریس کی تحریکوں میں وقف کرنے لگے، ایک پرجوش کانگریسی کی حیثیت سے اس کا سراپا تیار کیا گیا ہے، جو ملک کو آزاد کرنے کے لیے مضطرب ہے۔ آزادی کے اس متوالے کا لفظی پیکر اور تصویر ملاحظہ کیجیے:

''بڑھی ہوئی حجامت نے اختر کی تلخ مسکراہٹ کو اور تلخ کر دیا تھا، وہ کھدر کے کرتے پاجامے پر سیاہ واسکوٹ پہنے ہوئے تھا، ایک ٹاٹ ایسی چادر اس کے باوزن سینے کے گرہ لپٹی ہوئی تھی، اجڑے ہوئے بالوں کا ایک جنگل اس کے سارے وجود پر محیط تھا، بڑی بڑی قلمیں زرد رخساروں پر گیسوؤں کی طرح دراز تھیں،

داہنے ہاتھ کی دونوں لانبی لانبی انگلیاں نکوٹین سے پیلی تھیں، ہونٹوں پر سیاسی پٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن آنکھوں میں الاؤ دہک رہے تھے۔''

اختر بھائی انگریزوں کی نوکری قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے اور اس عزم پر قائم تھے کہ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا کر دم لیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام مصائب کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے، ان کے پہلو میں بھی ایک نرم دل تھا، محبت کی لطافتوں سے آشنا ہیں، لیکن نصب العین تک پہنچنے کے لیے وہ محبت کی رکاوٹ کو بھی برداشت نہیں کرتے۔ ان کی زندگی ذاتی مفاد سے زیادہ قومی مفاد کو عزیز رکھتی ہے، اس کردار میں زندگی کی طاقت ہے۔ اختر بھائی اس ناول کا ایک پرکشش ضمنی کردار ہے۔ قاضی عبدالستار نے اپنے تمام کرداروں کو نفسیاتی حقیقتوں اور جذباتی الجھنوں کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ''شب گزیدہ'' کے مقابلے میں ''پہلا اور آخری خط'' مجموعی طور پر ایک کمزور ناول ہے، ''داراشکوہ اور ''صلاح الدین ایوبی'' ان کے تاریخی ناول ہیں۔ اول الذکر ناول میں داراشکوہ کے کردار کی المناکی بے حد اثر انگیز اور پرکشش ہے، اس کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ تاریخی حقائق اور تاریخی اطلاعات کے ذریعے ہم پہلے سے جانتے ہیں کہ دارا کا انجام کیا ہوا، اسے کس مرحلے سے گزرنا پڑا؟ لیکن اس واقفیت کے باوجود مطالعے کے دوران وہی دلچسپی رہتی ہے جو کسی انجانے کردار اور اجنبی پلاٹ سے اپنی آزاد خیالی، وسیع النظری اور کشادہ دلی کی وجہ سے داراشکوہ ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم کردار بن گیا ہے۔ اگر اسے حکومت ملتی تو ممکن تھا کہ ہندوستانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا۔ ''داراشکوہ'' میں اس کردار کو روشن کرنے اور طاقتور بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''صلاح الدین ایوبی'' بھی ایک تاریخی ناول ہے، لیکن اس میں صلاح الدین ایوبی پر قاضی عبدالستار نے وہ زور قلم صرف نہیں کیا ہے جو ''داراشکوہ'' پر۔ صلاح الدین ایوبی صرف ایک جنگ جو اور فاتح نہیں ہے۔ اس ناول کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑے فاتح کے ساتھ ساتھ ایک رحم دل انسان بھی ہے ''صلاح الدین ایوبی'' کی خاص صفت ہے کہ اس ناول کے پس منظر میں ہندوستان کے مسائل اور سماجی گمراہیوں کو بھی پیش کیا گیا ہے بالخصوص ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا ہونے والے مسئلوں کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخی ناولوں میں کردار نگاری کا سلیقہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ناول کا ہر کردار تاریخ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، ناول نگار تو تاریخی کرداروں سے واقف ہوتا ہی ہے، اس کے قارئین بھی ان کے کرداروں سے آشنا ہوتے ہیں، اس لیے کردار نگاری کے دوران ناول نگار کو یہ احتیاط ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تاریخی ناول کا کردار کسی غلط رنگ میں پیش ہو جائے یا اس کے خال وخط میں اتنی بڑی ترمیم ہو جائے کہ قارئین کے محفوظ علم کے سامنے یہ ایک متضاد پیکر بن جائے۔ غیر تاریخی ناولوں کے کردار ناول نگار کے اپنے کردار ہوتے ہیں، قارئین پہلے سے ان کرداروں کے سلسلے میں نہ کچھ واقفیت رکھتے ہیں اور نہ وابستگی۔ تاریخی کرداروں سے قارئین کی واقفیت بھی ہوتی ہے، اور کسی نہ کسی حد تک وابستگی بھی، یہی وجہ ہے کہ تاریخی ناولوں میں کردار نگاری کے دوران ضبط واحتیاط کی سخت منزل سے فن کار کو گزرنا پڑتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے تاریخی ناولوں میں کردار نگاری کا ایک نیا جوہر سمویا ہے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے تاریخی ناولوں کے کرداروں کو تاریخی صداقتوں کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کی دل کشی اور دلچسپی بھی باقی رہی ہے۔ شرر لکھنوی اور صادق سردھنوی سے لے کر نسیم حجازی تک تاریخی ناول نگاری کا ایک لمبا سلسلہ ہے، لیکن کردار نگاری کا یہ پختہ شعور بہت کم نظر آتا ہے، شرر نے یقیناً پہلے تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے بڑے کارنامے انجام دیے، لیکن مقلدوں میں قاضی عبدالستار کے مقابلے کا کوئی دوسرا ناول نگار نظر نہیں آتا۔

قاضی عبدالستار اپنے ناولوں کی فضا کی بڑی مؤثر تشکیل کرتے تھے۔ منظر نگاری کو کسی علیحدہ عنصر کی حیثیت سے انھوں نے استعمال نہیں کیا ہے، لیکن وہ جس ماحول کو پیش کرتے تھے اسے زندہ اور تابناک بنا دیتے تھے، جو فضا سامنے آتی تھی وہ زندگی سے بھرپور ہوتی تھی۔ قرۃ العین حیدر کو بھی قاضی عبدالستار کی تخلیقی صلاحیتوں کا احساس ہی نہیں اعتراف بھی تھا:

> ''نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی سنانے کا ڈھنگ آتا تھا، بلکہ اپنے موضوع اور کرداروں سے بڑی گہری واقفیت بھی حاصل ہوتی تھی۔ اودھ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ''شب گزیدہ'' بھی اودھ کی فیوڈل تہذیب کا المیہ ہے، لیکن آزادی سے چند سال قبل کے اودھ کے یہ تعلق دار اور ان کی ہیئت محض ٹائپ یا علامتی کردار ہرگز نہیں ہیں بے حد حقیقی اور جیتے جاگتے انسانوں کی انفرادی اور طبقاتی شخصیتوں اور ان کے کربناک سماجی اور جذباتی رشتوں کے حیرت انگیز تنوع اور مٹے ہوئے معاشرے اور انسانی ڈرامے کی بے مثال مصوری کی ہے ''شب گزیدہ'' کے ایسے ناولٹ اردو میں غالباً نہیں لکھے گئے۔''

یہ بے مثال مصوری کردار اور ماحول کی بھی ہے اور ان کے جذبات وخیالات کی بھی۔ ''شب گزیدہ'' میں جاگیردارانہ ماحول کا جیتا جاگتا نقشہ سامنے آ گیا ہے، چھوٹی چھوٹی باتیں بھی لکھی ہیں تو اس طرح کہ ان کی تمام کیفیتیں قاری کے سامنے آ جاتی ہیں۔

''پھر کھیتوں نے سرسوں کے پھولوں کی بسنتی اوڑھنیاں اوڑھ لیں، اناج کی بالیاں پہن لیں اور ہواؤں کی ٹھنڈی سر میں سرسراہٹوں پر دل کی آواز میں گنگنانے لگیں، ہولی آتے آتے ڈھولکوں کے کڑے کھینچنے لگے۔''

اس طرح کے دل کش نقوش اور مناظر ''شب گزیدہ'' میں جابجا بکھرے پڑے ہیں، ماحول نگاری اور معاشرہ نگاری کے سلسلے میں قاضی عبدالستار کی تخلیقی صلاحیت نے کمال فن دکھلایا ہے۔ ''داراشکوہ'' میں سامو گڑھ کی لڑائی کا نقشہ بھی بے حد پراثر ہے، میدان جنگ کی ایک سچی تصویر پڑھنے والوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ''صلاح الدین ایوبی'' میں بھی یہ صفت موجود ہے۔ قدیم ماحول کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ ماحول ایک عصری ماحول بن گیا ہے، قدیم معاشرے میں روح پھونک کر اسے زندہ کرنا اور مؤثر انداز میں پیش کرنا یقینی آسان بات نہیں ہے۔ ''پہلا اور آخری خط'' میں تعلق دارانہ نظام کی بے روح اور کھوکھلی تہذیب کا نہایت مکمل انعکاس ہوا ہے۔ ماحول آفرینی، فضا بندی اور معاشرہ نگاری کی صلاحیت بھی نکھر کر سامنے آئی ہے۔ قاضی عبدالستار کے الفاظ بیجا استعمال سے گریز کرتے تھے۔ کم سے کم الفاظ اور کم سے کم جملوں میں زندہ تصویریں بنانا ان کی مخصوص صفت تھی، وہ بیک وقت شہر اور گاؤں میں بسنے والے تعلق دار گھرانوں کی تصویریں پیش کرتے تھے اور دونوں صورت حال اپنے اپنے پس منظر میں بے حد صداقت آمیز اور سچی ہوتی تھی۔ معاشرے کی عکاسی کے لیے الگ سے کوئی فضا تیار نہیں کرتے، کردار کے خیالات و افعال کے ذریعہ خود بخود ان کا انعکاس ہو جاتا تھا اور اسی لیے اس میں تصنع اور تکلف کا انداز نہیں ملتا۔ بقول شمس الرحمان فاروقی:

''قاضی عبدالستار کے قلم میں گزشتہ عظمتوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے کی حیرت انگیز قوت ہے۔''

گزشتہ عظمتوں کو زندہ کرنے اور ماضی کو حال میں کھڑا کر دینے کی اسی صلاحیت کی وجہ سے ڈاکٹر قمر رئیس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:

''داراشکوہ'' اردو تاریخی ناولوں کی تاریخ میں ''فردوسِ بریں'' کے بعد دوسرا ناول ہے۔''

قاضی عبدالستار کی معاشرہ نگاری اس لیے بھی لائق توجہ تھی کہ وہ معاشرے کی صرف خارجی کیفیات کی ترجمانی نہیں کرتے۔ معاشرے کی اندرونی سطح پر کش مکش اور پیچیدگیاں ہوتی تھیں وہ بھی قارئین کے سامنے روشن ہوا ٹھتی تھیں، چنانچہ داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے معاشرے کی مکمل تصویر ابھر ہوا ٹھتی تھی۔

قاضی عبدالستار واقعہ نگاری کا پختہ اور بالیدہ شعور رکھتے تھے۔ ان کے ناولوں کے واقعات میں بھرتی کے واقعے نہیں ملتے۔ مرکزی قصہ پورے اہتمام و تنظیم کے ساتھ اپنے اختتام کی طرف بڑھتا تھا۔ واقعات کی باہمی ترتیب کا سلیقہ قاضی عبدالستار کے اندر بدرجۂ اتم تھا۔ وہ واقعوں کے نشیب و فراز کے موقع و محل سے اچھی طرح واقف تھے۔ ''شب گزیدہ'' کے واقعات میں گہرا ربط اور مضبوط تنظیم ہے۔ کبھی کبھی جزئیات نگاری کے ذریعے انھوں نے واقعوں کو آپس میں اس طرح مربوط کیا ہے کہ ان کی فنکارانہ ہوش مندی کی داد دینی پڑتی ہے۔ ''شب گزیدہ'' میں جام نگر کے جاگیردار صاحب کے گرد ناول کے واقعات رقص کرتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے جمی کو محض اس جرم پر موت کی خاموشی وادی میں پہنچا دیا کہ وہ قدامت پرستی کے خلاف روشن خیالی کی ترویج چاہتا تھا، جمی کی راہ کا روڑا رحمت علی خاں ہے جو جاگیردار صاحب پر بری طرح حاوی ہے اور اپنا الّو سیدھا کرنے کی تاک میں رہتا ہے، اسی کی سازشوں کی وجہ سے جمّی کی جان گئی۔ ''شب گزیدہ'' کا اصل مسئلہ جدید و قدیم کی کش مکش کا مسئلہ ہے، روایتوں اور جدّت پسندیوں کے تصادم کا مسئلہ ہے۔ جاگیردارانہ نظام باقی تو تھا، لیکن اس کی دیواریں متزلزل ہونے لگی تھیں، جدید علوم کی روشنی نے معاشرے کے تمام گوشوں کو منور کرنا شروع کر دیا تھا اور ہر گوشۂ حیات نئی تعلیم کے اثرات کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھا، قاضی عبدالستار نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ''شب گزیدہ'' کے واقعات کو منظم کیا ہے۔ واقعات کے اس تنظیمی شعور کا مظاہرہ ان کے دوسرے ناولوں میں بھی ہوا ہے ''داراشکوہ'' اور ''صلاح الدین ایوبی'' میں بھٹکنے کا اندیشہ تھا، کیونکہ تاریخی ناولوں میں ناول نگار کو اچھی خاصی رعایت حاصل ہوتی ہے، قصے کے مرکزی تصور سے ہٹ کر تعمیر ماجرا کے دوران وہ غیر ضروری واقعوں کے سہارے بھی لے سکتا ہے، لیکن ان دونوں تاریخی ناولوں میں بھی عبدالستار نے ضبط و احتیاط کے ساتھ قدم بڑھایا ہے۔ ان کی واقعہ نگاری بھی بے حد مربوط اور جامع ہے۔ اگرچہ ''صلاح الدین ایوبی'' میں قاضی عبدالستار نے تاریخی حقائق کے آئینے میں موجودہ ہندوستان کے مسائل کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی واقعہ نگاری کے دوران وہ کہیں بے راہ روی کے شکار نہیں ہوئے، آج کے ہندو مسلم مسئلے اور فرقہ وارانہ فسادات کو قاضی عبدالستار نے بڑے سلیقے سے ماضی کے خزانوں میں تلاش کیا ہے اور یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ ہر دور میں مظلوم و مجبور آلام و مصائب کا شکار رہا ہے اور لڑائیوں اور فسادات کا سب سے زیادہ نقصان ہر دور میں انھیں ہی اٹھانا پڑا ہے، خوف و ہراس کی وجہ سے ان لوگوں کو کبھی کبھی ذلیل حرکتوں میں بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے، یہ بات ماضی میں بھی اور آج کے مہذب تر معاشرے میں بھی موجود ہے:

''قرآن مجید کی قسم میرے گھر میں ایک بیٹی ہے، جسے میں نے مقدس باپ کی خدمت کے لیے بھیج دیا ہے، آپ اس بچے کی فکر نہ کریں یہ تو اس کے پاس بھی روتا ہے یہ تو اس دن سے روئے جاتا ہے جس دن سے اس کا باپ آقا کے بیٹے کے سچے خادم سے گستاخی کے جرم میں قتل ہوا ہے، یہ تو یوں بھی میرے پاس رہتا ہے، آپ سکینہ کے ساتھ آرام کریں میں اسے لیے جاتا ہوں۔''

یہ بے ضمیری، یہ بے آبروئی، یہ بے حیائی اور یہ ذلت ورسوائی آج کے متمدن معاشرے میں بھی پائی جاتی ہے۔ قاضی عبدالستار نے ان تاریخی واقعات وحقائق کے پس منظر میں عصری صداقت کا خمیر بھر دیا ہے، غربت وافلاس اور ظلم وستم کی مؤثر صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ مختصر یہ کہ ناولوں میں واقعہ نگاری کے دوران قاضی عبدالستار بے حد نظم وضبط اور احتیاط واہتمام سے کام لیتے تھے۔

چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس لیے سامنے آتا ہے کہ قصے کے مرکزی تاثر میں اضافے کا سبب بنے۔ چنانچہ فطری طور پر قاضی عبدالستار کے ناولوں کے پلاٹ میں خوبصورت جامعیت پیدا ہوجاتی ہے۔ پلاٹ میں واقعات اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ ناولوں کا پلاٹ کہیں پر ڈھیلا نہیں ہوتا، پلاٹ کی تشکیل کے سلسلے میں واقعات کا آپسی اور باہمی انضباط بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مضبوط اور سڈول پلاٹ قاریوں کو ذہنی انتشار میں مبتلا ہونے سے بچالیتا ہے۔ پلاٹ کی تعمیر میں واقعات کے تسلسل کے ساتھ ساتھ مکالمے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کے ناولوں میں مکالمہ نگاری کی صفت ان کی زبردست مشاقی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ہر جملہ چاق تلا مختصر اور مکمل ہوتا ہے، مکالموں کی زبان ناول کے ماحول اور کرداروں کے مزاج کی مطابقت سے استعمال کی گئی ہے، تشبیہات ومحاورات کے برمحل استعمال سے ان کے اسلوب میں خوبصورتی، دلکشی اور برجستگی پیدا ہوجاتی ہے، ''داراشکوہ'' کے آخری حصے میں تو ناول کی زبان شگفتگی کی حد سے گزر کر شاعرانہ ہوگئی ہے، جس کے نتیجے میں اورنگ زیب کی عظمت اور شان وشوکت اس طرح ابھر آئی کہ ''داراشکوہ'' کا المیہ اس کے نزدیک کمزور نظر آنے لگا ہے:

''لالہ کے بے محابا حسن کے ہولناک تقاضوں سے مسرور ہوا، آہستہ سے سر کو جنبش دی، سر کی ابھی جنبش ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے بھرپور ٹھوکر مار کر رقص کا آغاز کیا، جیسے جھلستی گرمیوں کے پہلے روزے کے افطار کی توپ داغ گئی ہو۔''

یہ انداز بیان اور یہ اسلوب نگارش، قارئین کی توجہ اور انہماک کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ ناول کی زبان اور طرز بیان کی دلکشی اور جاذبیت، ندرت اور تازگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ناول کے اخیر تک قارئین کی دلچسپی ناول کے قصے سے قائم رہتی ہے، البتہ زبان اور طرز بیان پر اس حد تک زور نہ دیا جائے کہ ناول کا قاری زبان اور طرز بیان کی جادونگاری ہی میں گم ہوکر رہ جائے، لیکن تازگی اور ندرت پر اس حد تک توجہ تو دینی ہی چاہیے کہ ناول کا قصہ ہی بااثر ہوسکے، سطحی زبان اور روایتی انداز بیان ناول کے قصے کے حسن واثر کو زائل کردیتا ہے۔ قاضی عبدالستار کے ناولوں کی زبان تھی صاف ستھری اور بامحاورہ زبان، انداز بیان میں بھی طاقت اور دلکشی تھی، وہ عام فہم اور روزمرّہ کی زبان استعمال کرتے تھے۔ کہیں کہیں کرداروں کو اپنے ماحول سے ہم آہنگ رکھنے کے لیے ''اودھی'' کے فقروں اور جملوں کا استعمال بھی کرتے تھے مگر بڑی روانی اور صفائی کے ساتھ۔

قصہ نگاری کے انداز واسلوب سے اچھی طرح ہی نہیں قاضی عبدالستار کے اندر واقعات کو اثر انگیز بنانے کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ اسی اسلوب نگارش کی تازگی کا فیض تھا کہ وہ ناول کی صورتِ حال اور فضاؤں کو قوتِ گویائی دے دیتے تھے اور ماضی کی عظمتوں میں روحِ تازہ بھر دیتے تھے۔ ناول میں واقعات کے درمیان جب کوئی المناک اور درد انگیز کیفیت پیش ہوتی تھی تو اس پیشکش میں اتنی جانداری اور اثر انگیزی موجزن ہوتی تھی کہ قارئین کے دل بھی بے چین ہواٹھتے تھے، یہ بڑی بات ہے کہ قاری ناول کے کردار سے جذباتی اور فکری سطح پر وابستہ ہوجائے۔ کرداروں اور پڑھنے والوں کی جذباتی اور فکری وابستگی ناول کی کامیابی کی دلیل ہے۔ قاضی عبدالستار نے جنسی پیچیدگیوں، الجھنوں اور مسئلوں کو بھی پیش نظر رکھا تھا:

''ارے اب برابر کا لڑکا گھر میں ہے، اس لیے گھر کے اندر نہیں کرتے، نہیں تو محلے ٹولے کی کون صورت شکل کی عورت چھوڑی ہے، جب تک پلنگ پر دو عورتیں نہ ہوں وہ سوئے نہیں ہیں۔ ہم لوگ تو مٹی کی ہانڈی ہیں۔ ایک میلی ہوئی دوسری منگالی۔''

جرأتِ اظہار کے ساتھ یہاں وہ احتیاط بھی دامن گیر ہے جو ایک مہذب اور متمدن ماحول کے مزاج کی خصوصیت ہے، یہ موقع وہ تھا کہ لفظ وبیان کی ہلکی سی سہل پسندی، عبارت میں تلذذ اور عرنانیت پیدا کردیتی ہے۔ جذبات کا بیان تو ہے، لیکن اسلوب میں حقیقت کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ دامن تحریر ابتذال سے محفوظ رہا ہے۔ بہرحال قاضی عبدالستار ناول نگاروں کی صف میں ایک نمایاں مقام کے حامل تھے۔

◆◆◆